غزلیں

وزیر آغا

مکتبہ اُردو زبان

ضابطہ

حقوق	بحقِ مصنّف محفوظ
طبع	اوّل
ناشر	نُصرت انوار
مطبع	مکتبہ جدید پریس لاہور
سرورق	اسلم کمال
خطاطی	تمکین شیرازی
ماہ وسالِ اشاعت	مئی ۱۹۷۳ء
قیمت	پانچ روپے

مکتبہ اُردو زبان ریلوے روڈ سرگودھا

اصغر، انور، جمیل اور سجاد کے نام

کیسے کہوں کہ میں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ، زمیں بے لباس تھی
میلوں تلک تھی جھلسی ہوئی دوپہر کی قاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی

مُصنّف کے دوسرے شعری مجموعے

شام اور سائے (نظمیں)

دِن کا زرد پہاڑ (نظمیں اور غزلیں)

ترتیب

نردبان	وزیر آغا	۹
دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا		۱۳
جو ہو سکے تو تماشہ نہ یہ دکھا مجھ کو		۱۵
نکلے سفر پہ ہم تو قمر ہم رکاب تھا		۱۷
وہ کہ تھا چشمۂ صفا کی طرح		۱۹
چھوٹا ترا نگر تو ہم اپنے نگر گئے		۲۱
کیا لمس تھا کہ سارا بدن جگمگا گیا		۲۳
جبینِ سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا		۲۵
بارش ہوئی تو ڈھل کے سبکسار ہو گئے		۲۷
کب سے ہے تیری کھوج میں اے صبحِ بے نشاں		۲۹
کس کس سے نہ وہ لپٹ رہا تھا		۳۱
بادل برس کے کھل گیا رُت مہرباں ہوئی		۳۲

وہ پھول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے ۳۵
فقط اِک سانس اپنی ہم نوا ہے ۳۷
گِر کر چِتا میں دِن کی سُلگنے لگی ہے شام ۳۹
کیا حادثہ ہوا کہ بکھرنے لگی ہے شام ۴۱
کبھی کانٹوں پہ موتی بو گئے ہو ۴۳
منظر تھا راکھ اور طبیعت اداس تھی ۴۵
شب کٹ چکی تھی اور سحر کا پتا نہ تھا ۴۷
چھینٹا سا اوس کا مجھے بیدار کر گیا ۴۹
پتّے کہ زیورات تھے اُس شاخسار کے ۵۱
مانا کہ تیز آگ کی حِدّت ہوا میں ہے ۵۳
ہے سچ اگر کہ رنگوں کا طوفان ٹل گیا ۵۵
کبھی کبھی وہ نظر مجھ سے بھی ملاتا ہے ۵۷
ترے جہاں میں کوئی پُرفشاں نہیں ملتا ۵۹
دھار سی تازہ لہو کی شبنم افشانی میں ہے ۶۱
آیا وہ تیرے پاس جو خُود سے جُدا ہوا ۶۳
شبِ سیاہ میں جس طرح کاہکشاں آباد ۶۵
مانا ستارے شب کے سدا جگمگائیں گے ۶۷
قابو ہی میں گر وقت کا رہوار نہیں ہے ۶۹
بیتی باتوں سے مجھے بہلا نہیں ۷۱

وہ کون تھا جو خون کے دھارے میں بہہ گیا	۷۳
رات کے سیپ سے جب درد رہا ہوتا ہے	۷۵
ستم ہوا کا اگر تیرے تن کو راس نہیں	۷۷
آندھی کے چابکوں سے ہرے پات جھڑ گئے	۷۹
مرے راستے میں جو یہ پتھر پڑا ہے	۸۱
تو گم پڑا ہے اپنے خیالوں کی دھول میں	۸۳
صورت سے آشنا تھا مگر جانتا نہ تھا	۸۵
چمن میں آکے عجب اپنے دل کا حال ہوا	۸۷
بادل چھٹے تو رات کا ہر زخم وا ہوا	۸۹
وہ دن کہاں کہ ریت کے اندھے غبار میں	۹۱
گر ہم سے نہیں یہ گفتگو ہے	۹۳
آنکھ میں تیری اگر صحرا نہیں	۹۵
مٹی اڑی تو پھولتی سرسوں کا دم گھٹا	۹۷
پہلا ہی گرم لو کا تھپیڑا نہ سہہ سکی	۹۹
روک کر خوشبو نے میرا راستہ مجھ سے کہا	۱۰۱
دھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا	۱۰۳

اِک بار ہم نے پار کیا چُپ کا ریگ زار
پھر عُمر بھر اُڑتے رہے لفظوں کی دھُول میں

نردبان!

شاعر کی ذات کئی منزلہ عمارت کی طرح ہے۔ اگر اس کے ہاں ذوقِ جستجو اور جذبۂ سیاحت کی معمولی سی رمق بھی موجود ہے تو وہ عمرِ عزیز اس عمارت کی محض ایک منزل میں رہ کر بسر نہیں کرے گا۔ بقولِ غالب — "اقامت جاودانی ہے اور اُسی ایک نیک بخت کے ساتھ زندگانی ہے۔ اِس تصور سے جی گھبراتا ہے اور کلیجہ منہ کو آتا ہے" مصیبت یہ ہے کہ اکثر شاعر ساری زندگی ایک ہی منزل کی کھڑکی میں بیٹھ کر گزار دیتے ہیں۔ نہ ان کا جی گھبراتا ہے نہ کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ممکن ہے یہ بات وفاداری بشرطِ استواری کے مقولے کے تابع ہو مگر وفاداری سے اگر شخصیت اور کلام کے زنگ آلود ہونے کا شمہ بھر بھی احتمال ہو تو پھر شاعر کو لازم ہے کہ وہ چند روز کے لئے سہی، نقلِ مکانی ضرور کر جائے۔

میرا قصّہ یہ ہے کہ میں نے اپنی ادبی زندگی کا معتدبہ حصّہ نظم کی معیت میں گزارا اور یہ آج سے صرف چند برس پہلے کا واقعہ ہے کہ میں سنجیدگی سے غزل کی طرف متوجّہ ہوا۔ گویا میں نے ایک طویل مدّت عمارت کی زیریں منزل میں بسر کی ہے۔ اس منزل سے مجھے ہمیشہ بڑا لگاؤ محسوس ہوا۔ ایک تو اس لئے کہ اس کی ساری کھڑکیاں گلی میں کھلتی تھیں اور میں اپنے قریب سے گزرتے ہوئے قدموں کی چاپ کو سُن سکتا تھا۔ دوسرے اس منزل میں رہتے ہوئے مجھے زمین کی باس اور گلی کے شور سے بھی تعارف حاصل ہوتا تھا۔ تیسرے میں یہاں طائرانہ نظر کے بجائے تجزیاتی عمل میں بآسانی مُبتلا ہو سکتا تھا۔ پھر یہاں آزادی کی یہ صورت بھی تھی کہ میں محض ایک قدم بڑھا کر گلی میں اُتر سکتا تھا اور پھر گلیوں گلیوں سارے شہر میں گھوم سکتا تھا۔ اس منزل نے مجھے ہمیشہ انبوہ میں تنہائی کا احساس بخشا جس سے انفرادیت کو جِلا ملی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں سینۂ ارض پر بغیر کسی بیساکھی کے کھڑا ہوں۔ مگر کیسی بھی اچھی صورتِ حال کیوں نہ ہو، اگر وہ زیادہ عرصہ تک قائم رہے تو بالآخر جان بن جاتی ہے۔ چنانچہ دل میں یہ آرزو چٹکیاں لینے لگی کہ کھلی فضا میں لمبے لمبے سانس لینے کے لئے عمارت کی بالائی منزل کی یاترا کرنی چاہئیے۔ میرے لئے یہ منزل شجرِ ممنوعہ تو نہیں تھی لیکن اُفتادِ طبع کے باعث میں زیریں منزل میں زیادہ عافیت محسوس کرتا تھا۔ پھر ایک روز جب سیاحت کے جذبے نے زور پکڑا اور مجھے دم گھٹنے کا احساس کچھ زیادہ ہی شدت سے ہُوا تو میں ایک لمحۂ اضطراب میں زیریں منزل کو خیرباد کہہ کر بالائی منزل میں آگیا اور یہاں آتے ہی مجھے یوں لگا جیسے ساری کائنات ہی تبدیل ہو گئی ہے۔

عجیب منظر تھا! شہر کے سارے مکان زمین میں دھنس گئے تھے اور ان کے

مکین بونے نظر آ رہے تھے۔ آسمان اب ایک جھکی ہوئی ٹین کی چھت نہیں تھا بلکہ ایک وسیع کینوس کی طرح دُور دُور تک پھیل گیا تھا۔ چاروں طرف زمین و آسمان گلے مل رہے تھے۔ دُور دیس کے پہاڑ ایک سرمئی لکیر کی طرح نمودار ہو گئے تھے اور کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ انگشت سلوٹوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ تب اچانک وہ سارا شہر جو مکانوں اور گلیوں میں منقسم ہونے کے باعث مجھے کبھی پوری طرح نظر نہیں آیا تھا، ایک فردِ واحد کی طرح دکھائی دیا۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور دُکھوں نے میرے دل میں چھپی ہوئی اجتماعی خوشیوں اور دُکھوں کے لیے جگہ خالی کر دی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں کوئی تنہا اور الگ تھلگ ہستی نہیں۔ جیسے اگر میں ایک فرد ہوں تو سارا معاشرہ میرے دل میں کلبلا رہا ہے اور اگر میں بیج ہوں تو سارا درخت مجھ میں سمایا ہوا ہے۔ چنانچہ اب میں منقطع یا منحرف نہیں بلکہ متحد اور مجتمع تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ میری آواز صدا بالصحرا نہیں بلکہ صدائے جرس ہے۔ غزل کے دیار کی یہ سیاحت مجھے ہمیشہ یاد رہے گی کہ یہاں آ کر میں نے بلندی پر سے چاروں طرف نظر دوڑائی اور اجتماعی زاویے سے زندگی کو دیکھنے کی سعادت حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

بالائی منزل میں ایک یہ نقص ضرور ہے کہ آپ اس کی کھڑکی سے باہر آ کر چند ثانیوں کے لیے ہوا میں معلق تو رہ سکتے ہیں لیکن بسلامت گلی میں اُتر نہیں سکتے اور میں بحیثیت فرد ہمیشہ کھڑکی سے باہر کی طرف گھورتا رہا ہوں۔ اس لیے اب میں شاید زیادہ دیر اس منزل میں قیام پذیر نہ رہ سکوں اور یا تو زیریں منزل کو لوٹ جاؤں یا چندے کسی اور منزل میں قیام کرنے کے لیے رُک جاؤں تاہم جو عرصہ میں نے اس بالائی منزل میں گزارا ہے وہ میرے لیے ایک نادر و نایاب تجربہ ہے اور میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔

وزیر آغا

سرگودھا۔ ۱۸ را پریل ۱۹۷۳ء

○

دِن ڈَھل چُکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا
سارا لہُو بدن کا رَواں مُشتِ پَر میں تھا

حدِّ افق پہ شام تھی خیمہ میں منتظر
آنسُو کا اِک پہاڑ سا حائل نظر میں تھا

جاتے کہاں کہ رات کی بانہیں تھیں مُشتعِل
چُھپتے کہاں کہ سارا جہاں اپنے گھر میں تھا

لو وہ بھی خشک ریت کے ٹیلے میں ڈھل گیا
کل تک جو اِک کوہِ گراں رہگذر میں تھا

اُترا تھا وحشی چڑیوں کا لشکر زمین پر
پھر اِک بھی سبز پات نہ سارے نگر میں تھا

پاگل سی اِک صدا کسی اُجڑے مکاں میں تھی
کھڑکی میں اِک چراغ بھری دوپہر میں تھا

اُس کا بدن تھا خون کی حدت سے شعلہ وش
سورج کا اِک گلاب سا طشتِ سحر میں تھا

○

جو ہو سکے تو تماشا نہ یہ دِکھا مجھ کو
ترا ہی رُوپ نظر آئے جا بجا مجھ کو

کبھی تو کوئی فلک سے اُتر کے پاس آئے
کبھی تو ڈسنے سے باز آئے فاصلہ مجھ کو

تلاش کرتے ہو پھولوں میں کیسے پاگل ہو
اُڑا کے لے بھی گئی صُبح کی ہَوا مجھ کو

کسے خبر کہ صدا کس طرف سے آئے گی
کہاں سے آ کے اُٹھائے گا قافلہ مجھ کو

تھا میرا نقشِ قدم ہی مرے تعاقب میں
وگرنہ لاکھ بُلاتی تری صدا مجھ کو

سمیٹتا رہا خود کو میں عمر بھر لیکن
بکھیرتا رہا شبنم کا سلسلہ مجھ کو

کھلی جو رات کی خوشبو تو سازشی جاگے
دہکتی آنکھوں نے گھیرے میں لے لیا مجھ کو

ٹھہر سکی نہ اگر چاندنی تو کیا غم ہے
یہی بہت ہے کہ تُو یاد آ گیا مجھ کو

○

نکلے سفر پہ ہم تو قمر ہم رکاب تھا
پھر صبح تک رفاقتِ شب کا عذاب تھا

دیکھا تو اک خفیف سی لرزش لبوں پہ تھی
پلکوں کے ساتھ چپکا ہوا کوئی خواب تھا

یہ بھی نہیں کہ تیری نظر مہرباں نہ تھی
تارا مرے نصیب کا زیرِ عتاب تھا

پڑھتے تھے صُبح و شام اُسے بار بار ہم
جیسے زمانہ ایک مقدّس کتاب تھا

یہ اور بات ڈھل نہ سکا آئینہ ترا
برسا وگرنہ ابرِ کرم بے حساب تھا

دیکھا جو ریگ زارِ ستمگر سے تو میرا گھر
آبِ رواں پہ بہتا ہوا اِک گلاب تھا

مَیں قید تیری آنکھ کی پُتلی میں تھا ابھی
تُو پار کر چکا نگہِ آفتاب تھا

میرے دُکھی سوال کا اُس شام تیرے پاس
بھیگی ہوئی نظر کے سِوا کیا جواب تھا

گر وہ زمانہ یاد کہ تھی آنکھ میں حیا
مابین دوستوں کے ابھی کچھ حجاب تھا

○

وہ کہ تھا چشمۂ صفا کی طرح
کل ملا مجھ کو زخمِ پا کی طرح

کون زندہ ہے اِس اندھیرے میں
اِک سِسکتی ہوئی صدا کی طرح

زنگ آلود گھر کا سنّاٹا،
اور میں ــــ چیختی ہوا کی طرح!

دوستی پتھروں سے مَیں نے کی
شام کی نرم دِل گھٹا کی طرح

تیز ناخن ہیں تیرے دُشمن کے
اور تُو — پھُول سی قبا کی طرح

بستروں میں دبک گئے تارے
چاند نِکلا کِسی بلا کی طرح

چاندنی گر پڑی درختوں پر
جاں بلب آخری دُعا کی طرح

بے ستوں ہے یہ گُنبدِ افلاک
تیری بھُولی ہوئی انا کی طرح

چھوٹا ترا نگر تو ہم اپنے نگر گئے
گہرے سمندروں کی تہوں میں اُتر گئے

شاید کہ تو نے کھول دی مٹھی بھری ہوئی
طشتِ فلک میں نقرئی سکے بکھر گئے

ہونٹوں کے سیپ سوکھے پڑے ہیں تو غم نہیں
آنکھوں کے خشک تال تو پانی سے بھر گئے

جھونکے نے بڑھ کے پیڑ کو چھیڑا تو دفعتاً
اُڑتے ہوئے فضا میں پرندوں کے پَر گئے

کہنے لگا کہ میں نے تمہیں کتنا دُکھ دیا
سپنے تمہارے چھین لیے سب، سحر گئے

اے آفتاب! آئینہ تیرا اگر ہے صاف
بتلا مجھے کہاں وہ مرے ہم سفر گئے؟

خود سے کہا کہ سایہ نہیں وہ ہے ساتھ ساتھ
یوں ہم ہَوا میں اُڑتے ہوئے اپنے گھر گئے

○

کیا لمس تھا کہ سارا بدن جگمگا گیا
پردے اُٹھے، نقاب ہٹے، فاصلہ گیا

پھر ایک دن ہوا نے کہا: مَیں تو تھک گئی
خوشبو کا بوجھ میری کمر کو جھکا گیا

ٹھہرو کہ آئینوں پہ ابھی گرد ہے جمی
سینوں کا سارا زہر نگاہوں میں آ گیا

کرتے ہو انتظار عبث اتنا جان لو
لوٹے گا اب تو شام ہی کو صُبح کا گیا

بننے لگیں گے پھر سے نشانِ قدم اگر
جھونکا ہَوا کا گرد بچھا کر چلا گیا

اِک شبنمیں لباس میں بھیگی پڑی تھی صبح
منظر کسی کی آنکھ کا منظر دکھا گیا

کون اب لکھے گا شام کے ماتھے پہ تیرا نام
سُورج تو تیرا نام بجُھا کر چلا گیا

جبینِ سنگ پہ لکھا مرا فسانہ گیا
مَیں رہگذر تھا مجھے رَوند کر زمانہ گیا

نقاب اوڑھ کے آئے تھے رات کے قزّاق
پگھلتی شام سے سب دھوپ کا خزانہ گیا

کِسے خبر وہ روانہ بھی ہو سکا کہ نہیں
تمہارے شہر سے جب اُس کا آب و دانہ گیا

وہ چل دیا تو نگاہوں سے کہ، دِلوں سے غرور
لبوں سے زہر، ہواؤں سے تازیانہ گیا

یہ جانتا ہُوں کہ تُو نے لیا تھا روک اُسے
مگر وہ آتشیں آنسُو تجُھے جلا نہ گیا؟

مَیں ایک ڈولتا ساگر مجُھے اُٹھاتا کون
گھٹا اُٹھا کے چلی تھی مگر چلا نہ گیا

کہاں گیا مَیں بچھڑ کر کِسے خبر ہو گی
جو ایک بار یہاں سے ہوا روانہ، گیا

○

بارش ہُوئی تو دُھل کے سُبکسار ہو گئے
آندھی چلی تو ریت کی دیوار ہو گئے

رہوارِ شب کے ساتھ چلے جو پیادہ پا
وہ لوگ خُود بھی صُورتِ رہوار ہو گئے

سوچا یہ تھا کہ ہم بھی بنائیں گے اُس کا نقش
دیکھا اُسے تو نقش بہ دیوار ہو گئے

قدموں کے سیلِ تُند سے اب راستہ بناؤ
نقشوں کے سب رواج تو بے کار ہو گئے

لازم نہیں کہ تُم سے ہی پہنچے ہمیں گزند
خود ہم بھی اپنے دَرپئے آزار ہو گئے

پھُوٹی سحر تو چھینٹے اُڑے دُور دُور تک
چہرے تمام شہر کے گُلنار ہو گئے

○

کب سے ہے تیری کھوج میں اے صبحِ بے نشاں
بے چہرہ ساعتوں کا تھکا ہارا کارواں

خود سے ہی باندھ لو کوئی پیمانِ دوستی
ڈھونڈو گے اِس سفر میں کوئی ہم سفر کہاں

آنکھیں کروں میں بند تو ڈستی ہے تیرگی
دیکھوں تو چُبھنے لگتی ہیں خوابوں کی کرچیاں

آیا نسیمِ صُبح کی صُورت وہ شہر میں
کھِلنے لگیں اُداس مکانوں کی کھڑکیاں

مانا کہ تا اَبد نہیں جائے گی اُس کی باس
لیکن وہ پھُول ایسا بدن آئے تو یہاں

جب پَو پھٹی تو کہنے لگی اوس کی رِدا
سب چل دیئے گھروں کو مگر جاؤں میں کہاں؟

نِکلے تری تلاش میں ہم کچّی برف پر
پیڑی کے ساتھ بنتے گئے پاؤں کے نشاں

○

کِس کِس سے نہ وہ لپٹ رہا تھا
پاگل تھا، یُونہی چمٹ رہا تھا

دِن رات گُزر رہے تھے ایسے
مَیں جیسے وَرق اُلٹ رہا تھا

ساگر میں نہیں تھی مَوج اِک بھی
ساحل تھا کہ پھر بھی کٹ رہا تھا

میں بھی تو جھپٹ رہا تھا خود پر
جب میرا اثاثہ بٹ رہا تھا

دیکھا تو نظر تھی اُس کی جل تھل
مشکیزۂ ابر پھٹ رہا تھا

قسمت ہی میں روشنی نہیں تھی
بادل تو کبھی کا چھٹ رہا تھا

نشّہ تھا چڑھاؤ پر سحر دم
پیمانۂ عمر گھٹ رہا تھا

○

بادل برس کے کھل گیا رُت مہرباں ہوئی
بوڑھی زمیں نے تن کے کہا: میں جواں ہوئی

مکڑی نے پہلے جال بُنا میرے گرد، پھر
مونس بنی، رفیق بنی، پاسباں ہوئی

شب کی رکاب تھام کے وہ یوں ہوئی جُدا
دن چڑھتے چڑھتے بسری ہوئی داستاں ہوئی

کرتے ہوا ب تلاش ستاروں کو خاک پر
جیسے زمیں، زمیں نہ ہوئی آسماں ہوئی

چھاؤں کا ایسا قحط پڑا اس برس کہ دھوپ
ہر شو کھتے شجر کے لئے سائباں ہوئی

گیلی ہوا کے لمس میں کچھ تھا وگرنہ کب
کلیوں کی باس گلیوں کے اندر رواں ہوئی

آنا ہے گر تو آؤ کہ چلنے لگی ہوا،
کشتی سمندروں میں کھُلا بادباں ہوئی

بدلا زمانہ ایسا کہ ہونٹوں پہ تیرے بات
آئی ابھی نہیں تھی کہ وردِ زباں ہوئی

○

وہ پھول ہے تو اپنی ہی خوشبو میں تر رہے
بے وجہ کیوں ہوا کی طرح دَر بدر رہے

تُو بھی غلط نہیں ہے مگر اس قدر بتا
اپنے سِوا وہ اور کا کیوں ہم سفر رہے

اُلجھے وہ تیرگی سے، ڈرے اپنے آپ سے
کہنے کو چاندنی کی رِدا اوڑھ کر رہے

آواز کے بھنور میں گراؤ تو چُپ رہے
چُپ کی گپھا میں لاؤ تو وہ بول کر رہے

سر سے اُتارے برف کی دستار کس طرح
بُوڑھے سے اِک پہاڑ کی صُورت اگر رہے

جُز گردِ کائنات نہیں کچھ تو کیا اُسے
اِس گرد میں خراب وہ کیوں عمر بھر رہے

ہر لمحہ جیسے اوک لبالب بھری ہوئی
اور دِل تمام عُمر یُونہی بے خبر رہے؟

○

فقط اِک سانس اپنی ہم نوا ہے
وگرنہ کون باقی رہ گیا ہے

خفا مُدّت سے ہے آواز تیری
ٹپکتی آنکھ میری لب کُشا ہے

کہاں جاؤں کہ سب جانب ہیں آنکھیں
مرا تن جن سے چھلنی ہو گیا ہے

وہ رُت جب لوٹ کر آئی تو دیکھا
مکیں غائب، مکاں خالی پڑا ہے

ستاروں کے جلے کھیتوں میں کون اب
جُھکی پلکوں سے موتی چُن رہا ہے؟

خبر اخبار میں، پھر جگ ہنسائی
یہ کیسی موت کوئی مر گیا ہے!

چلو اپنی بھی جانب اب چلیں، ہم
یہ رستہ دیر سے سُونا پڑا ہے

○

کہتے ہو تم کہ خود میں سمٹنے لگی ہے شام
بھیگے پروں کے ساتھ جھپٹنے لگی ہے شام

آنسو، ستارے، جگنو، لرزتے ہوئے چراغ
لاکھوں چمکتی کرچوں میں بٹنے لگی ہے شام

صدیوں کے اک سفر سے جو لوٹی تو بے طلب
میری سیہ قبا میں سمٹنے لگی ہے شام

شاید مری طلب سے وہ ناآشنا نہیں
کانٹا سا بن کے تن سے چمٹنے لگی ہے شام

کاسے سے آفتاب کے بھر کر لہو کا جام
دامانِ آسماں پہ اُلٹنے لگی ہے شام

کیا حادثہ ہُوا کہ بکھرنے لگی ہے شام
بہروپ خشک پھُول کا بھرنے لگی ہے شام

سُورج کی گرم مُٹھی سے نِکلی تھی اور اب
کِس کی گداز گود میں گِرنے لگی ہے شام

ماتھے پہ دِن کے زخم سا دیکھا تو دَوڑ کر
اُس زخم کے شِگاف کو بھرنے لگی ہے شام

ہر ہر قدم پہ میری طرف مُڑ کے دیکھتی
زینے سے پتھروں کے اُترنے لگی ہے شام

آگے ہو جیسے قلزمِ تاریک کا سفر
کشتی میں پاؤں دھرتے ہی ڈرنے لگی ہے شام

آدھے قمر کے سامنے تاروں کے رُو برُو
پھر وعدہ لوٹ آنے کا کرنے لگی ہے شام

○

کبھی کانٹوں پہ موتی بو گئے ہو
کبھی چُپ چاپ مٹی ہو گئے ہو

گھنے جنگل میں گُم رستہ ہُوا ہے
بھری محفل میں تنہا ہو گئے ہو

سُنو تم صُبح کی دستک کا نغمہ
کہاں تاریکیوں میں کھو گئے ہو

کرن تو ہر بُنِ مُو سے اُڑی ہے
تمہیں بے دست و پا سے ہو گئے ہو

زمانے کی نہ لائے تاب تم بھی
گِرا کر اپنی پلکیں سو گئے ہو

ہزاروں بار پہلے بھی گِرے تم
مگر اِس بار پتھر ہو گئے ہو

○

منظر تھا راکھ اور طبیعت اُداس تھی
ہرچند تیری یاد مرے آس پاس تھی

میلوں تلک تھی جُھلسی ہوئی دوپہر کی تاش
سینے میں بند سینکڑوں صدیوں کی پیاس تھی

اُٹھے نہا کے شعلوں میں اپنے تو یہ کھُلا
دونوں جہاں میں پھیلی ہوئی تیری باس تھی

کیسے کہوں کہ مَیں نے کہاں کا سفر کیا
آکاش بے چراغ ، زمیں بے لباس تھی

غم تھا نہ سازگار تو پھر سوچ کس لئے
کالے سمندروں کی تھکن مجھ کو راس تھی

اب دھوپ میں اُٹے ہوئے رستوں پہ ہے سفر
وہ دن گئے کہ قدموں تلے نرم گھاس تھی!

○

شب کٹ چکی تھی اور سحر کا پتا نہ تھا
ہونے میں اور نہ ہونے میں، کچھ فاصلہ نہ تھا

جھکنے لگا تھا شہر کا مینار اور ہم
ایسے ڈرے کہ قدموں تلے راستہ نہ تھا

آواز میں مٹھاس بھی تھی اشتعال بھی
ساگر بجھے دِلوں کا مگر ڈولتا نہ تھا

ٹُو کب تھا کُلبلاتے ہوئے اُس ہجوم میں
پتھر اُٹھا کے تُو تو مجھے مارتا نہ تھا

وہ دِن بھی تھے کہ ساری زمیں ریگ زار تھی
یہ خار دار بول کوئی بولتا نہ تھا

جھونکے سے بھی ہَوا کے میں اب ٹُوٹنے لگا
وہ دِن کہاں کہ جُھکتا تھا میں ٹُوٹتا نہ تھا

چھینٹا سا اوس کا مجھے بیدار کر گیا
سارے گھروندے خواب کے مسمار کر گیا

چڑیوں کا شور سُن کے طبیعت چہک اُٹھی
باتوں کا زہر جسم کو بیمار کر گیا

آنکھیں اُداس، چہرے کی رنگت اڑی ہوئی
کیا حال میرا صبح کا اخبار کر گیا

کب سے ہے تُو سفر میں مگر اِس قدر بتا
طے کتنا فاصلہ ترا رہوار کر گیا؟

اُفتاد جب پڑی تو وہ مضبوط دِل عُقاب
ایسا اُڑا کہ ساتوں فلک پار کر گیا

بادل سے بھی نہ ختم ہُوا دُکھ کا سِلسلہ
وہ غم گُسار کوششِ بسیار کر گیا

تنہا میں ہی چیخنے پہ مُصر ورنہ قُفلِ غم
کِس دَر کو ایک پَل میں نہ دیوار کر گیا

میں نے یہ کب کہا تھا کہ آ دوستی کریں
وہ سنگ دل تو ایسے ہی انکار کر گیا

خوُد تو چلا گیا کہ اُسے کام تھے بہت
مُجھ کو سپُردِ پنجۂ اغیار کر گیا

پتے کہ زیورات تھے اُس شاخسار کے
ایسی چلی ہوا کہ ہوئے رہگزار کے

رُک رُک کے بج رہی تھیں شگوفوں کی جھانجنیں
ڈر ڈر کے آ رہے تھے پرندے بہار کے

جائیں گے ہم بھی خواب کے اُس شہر کی طرف
ناؤ پلٹ تو آئے مُسافر اُتار کے

کس کے جلو میں آئی سحر کچھ خبر نہیں
جُز یہ کہ ہر طرف تھے شگوفے انار کے

تالی بجا کے تُو نے اُڑائے بہت مگر
زخمی پرند اُڑ نہ سکے خستہ ڈار کے

آنگن کی راکھ ریشمیں آنچل میں بس گئی
جُوڑے کے ساتھ سُوکھ گئے پھُول پیار کے

زینے سے آفتاب کے اُتری سفید دھُوپ
کپڑے زمیں پہ بچھ گئے اُس بانکی نار کے

○

مانا کہ تیز آگ کی حدت ہوا میں ہے
لیکن وہ ایک برف کی سل جو قبا میں ہے

میں جانتا ہوں لوہے کی زنجیر تو نہیں
جھنکار سب کی سب مری آواز پا میں ہے

سینے کے بند سیپ میں اک راز تھا سو آج
پلکوں سے ٹوٹتی ہوئی مدھم صدا میں ہے

وہ لمحہ جس نے روک لیا تھا اُسے کبھی
ٹھہرا ہوا وہ لمحہ ابھی تک خلا میں ہے

کیسے اُڑوں کہ خاک نہیں چھوڑتی مجھے
کیوں کر رُکوں کہ تازہ لہُو دست و پا میں ہے

جی چاہتا ہے نذر کروں آج پھر تجھے
وہ پرِ شکستہ گُل کہ دلِ نارسا میں ہے

ہر چند تیرا رنگ ہے پھُولوں میں جا بجا
رفتار میری موجۂ بادِ صبا میں ہے

ہے سچ اگر کہ رنگوں کا طوفان ٹل گیا
گالوں پہ تیرے کون یہ سُرخی سی مَل گیا

اِک سِل تھی برف کی کہ سدا روبرُو رہی
کہسار گرد ہو گئے لوہا پگھل گیا

چھِن بھر کو چاندنی کی رِدا نے چھُوا مجھے
نفرت سے ماہتاب کا چہرہ بدل گیا

دِن کو رہا میں اپنے ہی سائے سے بدگماں
شب آگئی تو اپنے ہی سائے میں ڈھل گیا

بادل کو دیکھتے ہی لگی تن بدن میں آگ
جب تک پھوار آئے بھرا شہر جل گیا

چلتا رہا ہوں اپنی ہی جانب تمام عُمر
تُو نے غلط کہا کہ میں گھر سے نِکل گیا

گھبرا کے میں نے دیکھا تھا اُڑتے پرند کو
تُو سوچنے لگا کہ مرا دِل مچل گیا

کبھی کبھی وہ نظر مجھ سے بھی مِلاتا ہے
وگرنہ اپنی ہی آنکھوں کے دُکھ اُٹھاتا ہے

چلے بھی آؤ کہ سب روگ اب تمام ہوئے
خود اپنا بوجھ کہاں تک کوئی اُٹھاتا ہے

وہ تشنگی ہے کہ دُکھتے ہیں میرے ہونٹ اگر
پلک سے اوس کا قطرہ ہمک کے آتا ہے

تُو نا سمجھ تھا کہ دہلیز تک چلا آیا
زمانہ اب تجھے بازار میں بُلاتا ہے

ہوں خشک ریت کا صحرا تو میری خاطر کیوں
سنہری بجرے خیالات کے بہاتا ہے؟

نشانِ میل کی صُورت ہوں رہگزر کے قریں
یہ کارواں مجھے چھُو کر گزرتا جاتا ہے

میں روشنی کی طرح ہوں ہر اک جگہ موجُود
یہ دیکھتا ہُوں تُو خود کو کہاں چھُپاتا ہے؟

○

ترے جہاں میں کوئی پُر فشاں نہیں مِلتا
کہیں بھی لکۂ ابرِ رواں نہیں مِلتا

چمکتے تاروں کا وہ اژدحام ہے کہ مجھے
تلاش کرنے پہ بھی آسماں نہیں مِلتا

پلک اُٹھاؤ تو نیلے سمندروں کا خروش
پلک گراؤ تو کچھ بھی یہاں نہیں مِلتا

ہَوا چلی تو چہکنے لگے لبوں کے پرند،
ہَوا رُکی تو کوئی مہرباں نہیں مِلتا

یہ کیا کہ آنکھوں کے پٹ تو کُھلے ہیں اور کہیں
ترے وجُود کا نام و نِشاں نہیں مِلتا

جو آ کے میرا ہی منظر مجھے دِکھا جائے
وہ یارِ مخلص و نامہرباں نہیں مِلتا

سجا کے آنکھ میں آنسُو نہ اِس قدر اِترا
بھرے جہاں میں یہ گوہر کہاں نہیں مِلتا

دھار سی تازہ لہو کی شبنم افشانی میں ہے
صُبح دم بھیگی ہوئی پلکوں کی تابانی میں ہے

آنکھ ہے لبریز جیسے رو پڑے گا تُو ابھی
جیسے ذلّت کا مُداوا آنکھ کے پانی میں ہے

میں نہیں ہارا تو میرے حوصلے کی داد دے
اِک نیا عزمِ سفر اس خستہ سامانی میں ہے

بے ثمر، بے رنگ موسم برف کی صورت سفید
اور دلِ اُمڈے ہوئے رنگوں کی طغیانی میں ہے

آگ ہے سینے میں تیرے موجزن تو یاد رکھ
شمع سی روشن اندھیرے گھر کی ویرانی میں ہے

اَنگنت رنگوں کے پَر بکھرے پڑے ہیں ہر طرف
وقت کا گھائل پرندہ پھر سے جولانی میں ہے

کس گھنے جنگل میں جا کر اب چھپیں اہلِ وطن
آنکھ سی اُبھری ہوئی سورج کی پیشانی میں ہے

○

آیا وہ تیرے پاس جو خُود سے جُدا ہُوا
چہرہ سا اِک لگا کے ترا ہم نوا ہُوا

وہ برگِ سبز جس کو اُڑا لے گیا تھا تُو
ڈھونڈا تو مِل گیا مجھے بَن میں پڑا ہُوا

شبنم سے اپنی پلکوں کو اتنا بھگو کہ مَیں
سوچوں کہ ایک سُوکھا شجر پھر ہرا ہُوا

اُوپر مجھے ستاروں کی بکھری ہوئی تھی راکھ
نیچے گھنے درختوں کا جنگل جلا ہُوا

میری طرف نگاہ اُٹھا اور غور کر
کب سے ہوں تیری راہ کا پتھر بنا ہُوا

آواز کے بھنور میں مجھے مت گرا کہ مَیں
کرنوں کا جال توڑ کے نکل ہی رہا ہُوا

کرنا پڑے گا اپنے ہی سائے میں اب قیام
چاروں طرف ہے دھُوپ کا صحرا بچھا ہُوا

○

شبِ سیاہ میں جس طرح کاہکشاں آباد
سدا رہے یہ تیری شامِ دوستاں آباد

عجیب رنگ ہے اب کے خروشِ دریا کا
ہے سطحِ آب پہ اک شہرِ بے نشاں آباد

کھلے کواڑ ہیں آنکھوں کے اور سناٹا
کبھی تو تم بھی کرو یہ حسیں مکاں آباد

میں جانتا ہوں کہ پہلے کھلا تھا عرش پہ تو
پھر اُس کے بعد کیا تُو نے یہ جہاں آباد

بنائے تو نے ستاروں سے گھر ہزاروں بار
مگر ہوا نہ کبھی تجھ سے آسماں آباد

اُڑی جو گرد تو اس خاک داں کو پہچانا
کھُلا کہ خاک سے تھا سارا خاک داں آباد

چلو کہ ہم بھی شفق زار میں کہیں بیٹھیں
چلو کہ ہم بھی کریں شامِ خستگاں آباد

مانا ستارے شب کے سدا جگمگائیں گے
بھڑکی چتا سحر کی تو کیا جل نہ جائیں گے؛

اُجلی ہواہیں ہم نے دیا ہے پروں کو کھول
اب جس طرف بہے گی ہوا بہتے جائیں گے

آنکھوں میں صف دُکھوں کی بچھانے کا فائدہ
ہم نے ترا فریب نہ کھایا نہ کھائیں گے

میری قبا بھی دے نہ سکے گی تجھے پناہ
جب بادلوں کے اسپ سیہ فام آئیں گے

دہلیز بھی عبور نہ کر پائے جو کبھی ،
کیسے وہ اب پہاڑ کے اُس پار جائیں گے؟

ہے شرط چشمہ پھُوٹ کے نکلے زمیں سے
لاکھوں پرند پیاس بُجھانے کو آئیں گے

چھٹکی جو چاندنی تو چٹخنے لگیں گے ہم
اور گفتگو کے پھُول سحر تک کھِلائیں گے

قابو ہی میں گر وقت کا رہوار نہیں ہے
میں کیسے کہوں راستہ ہموار نہیں ہے

سر پہ نہیں شمشیرِ برہنہ کی طرح دھوپ
یا قدموں تلے سلسلۂ خار نہیں ہے؟

آواز تو آتی ہے مگر رُک نہیں پاتی
کیا شہر میں تیرے کوئی دیوار نہیں ہے؟

مَیں بھی تو مُصر ہوں کہ ہَوا بن کے اُڑوں میں
اور پھُول کی خُوشبو کو بھی انکار نہیں ہے

مانوس نہیں تُم سے رہا ہوگا وگرنہ،
پالے ہُوئے پنچھی کی یہ چہکار نہیں ہے

کیسے نظر آئے مجھے صُورت وہ شناسا
دریا بھی تو اب آئینہ بردار نہیں ہے

مانا کہ سبھی اہلِ زمانہ ہوئے بیمار
ہے تُجھ کو یقیں آپ تو بیمار نہیں ہے

○

بیتی باتوں سے مجھے بہلا نہیں
اے زمانے! لَوٹ کر اَب آ نہیں

ہم ورق چاندی کے — اے پاگل ہوا
بھُول کر بھی ہم سے تُو ٹکرا نہیں

چل پڑے تو کٹ ہی جائے گا سفر
اے مری آوازِ پا گھبرا نہیں

مُٹھیاں بھر بھر کے بے دردی سے تُو
اپنی خاکستر کو یُوں بکھرا نہیں

چھیڑ مت جانے کا قصہ بار بار
کہکشاں کی رہگزر دِکھلا نہیں

رات بھر کہتا رہا جُگنُو سے مَیں
ٹھوکریں یُوں ہر قدم پر کھا نہیں

رو اگر مرغوب ہے رونا تجُھے
آنکھ سے چنگاریاں برسا نہیں

○

وہ کون تھا جو خون کے دھارے میں بہہ گیا
زخموں کی ایک باڑ سی چہرے پہ سہہ گیا

مجھ کو نہ روک میری نظر منزلوں پہ ہے
خود کو اٹھا کے تو مرے قدموں میں رہ گیا

ریگِ رواں سے پھوٹ کے نکلے کنول ہزار
جاتے ہوئے وہ بات عجب مجھ سے کہہ گیا

پتھر کا وہ مکاں کہ تجھے جس پہ ناز تھا
شبنم کی ایک بوند گری اور بہہ گیا

موتی بنا تو ڈوب گیا اُس نگاہ میں
ذرّہ بنا تو وقت کا ہر وار سہہ گیا

○

رات کے سیپ سے جب دُر درہا ہوتا ہے
صُبح دم سینکڑوں پلکوں پہ سجا ہوتا ہے

زخم دروازہ نہیں ہے کہ مقفل کرلیں
زخم ہر حال میں آغوش کُشا ہوتا ہے

وہ کبھی نیلا سمندر ہے کبھی سبز زمیں
کبھی موجوں کبھی پھولوں میں گھرا ہوتا ہے

ہم نے خود دیکھے ہیں آواز کے اُڑتے ہوئے رنگ
کوئی آنسو اُسے جب چھیڑ رہا ہوتا ہے

گرد اُڑتی ہے تو اُٹ جاتے ہیں اشجار تمام
اوس گرتی ہے تو اِک حشر بپا ہوتا ہے

روگ پھر روگ ہے پتھر کو بھی لگ سکتا ہے
درد دِل میں کبھی تیرے بھی بپا ہوتا ہے!

کم نہیں کرب کی لہروں کا تناؤ لیکن
چاند نکلے تو یہ طوفان سوا ہوتا ہے

ستم ہوا کہ اگر تیرے تن کو راس نہیں
کہاں سے لاؤں وہ جھونکا جو میرے پاس نہیں

پگھل چکا ہوں تمازت میں آفتاب کی میں
مرا وجود بھی اب میرے آس پاس نہیں

مرے نصیب میں کب تھی برہنگی اپنی
ملی وہ مجھ کو تمنا کہ بے لباس نہیں

کِسے خبر کہ کہاں چھوڑ کر چلی جائے
صبا کے چال چلن سے تو رُو شناس نہیں

کھُلا پڑا ہُوں ہوا میں کتاب کی صُورت
وہی پڑھے مجھے آکر جو ناسپاس نہیں

لہُو کے ساتھ گئی تن بدن کی سب چہکار
چُبھن کرن میں نہیں ہے کلی میں باس نہیں

○

آندھی کے چابکوں سے ہرے پات جھڑ گئے
جو بچ گئے وہ آپ ہی شاخوں پہ سڑ گئے

کیا قہر ہے کہ پہلے لکھو خود لہو سے نام
پھر چیخ کر کہو کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

میلا ہوا فلک تو چمکنے لگی ہوا
ساگر کے رُخ پہ کتنے شکن اور پڑ گئے

آخر پلٹ کے شام نے دیکھا مری طرف
کرنوں کے تیر میری ہتھیلی میں گڑ گئے

سُننا پڑی جو اُس کو مری داستانِ غم
عارض کی سِل پہ کتنے نگینے سے جڑ گئے

○

مرے راستے میں جو پتھر پڑا ہے
نگینے کی صورت زمیں میں جڑا ہے

یہ کیا ہو گیا ہے کہ میرا ہی سایہ
مرے جسم سے کٹ کے اوندھا پڑا ہے

جدھر دیکھتا ہے ہوا رُو برو ہے
یہ دِل زرد پتے کی صورت کھڑا ہے

اندھیرے کی گلیاں بہت تنگ دِل ہیں
اُجالے کا میدان کِتنا بڑا ہے

وہی رہ نوَردی وہی رُو سیاہی
وہی اِک مُسافر کہ ضِد پر اَڑا ہے

کبھی اپنے اندر رہا قید برسوں
کبھی مُدّتوں آسماں سے لڑا ہے

لڑھکتے ہُوئے پتھّروں کو بتاؤ
ہمالہ جہاں تھا وہیں پر کھڑا ہے

○

تُو گُم پڑا ہے اپنے خیالوں کی دُھول میں
مَیں کیوں تجھے تلاش کروں پھُول پھُول میں

آئی تھی اِک صدا کہ چلے آؤ —— اور میں
صحرا عبور کر گیا شوقِ فضُول میں

جھپٹے وہ مجھ پہ تول کے کُندے ہزار بار
خود کو لہُو لہان کیا اپنی بھُول میں

آئے تو ہو مگر نہ قریب آؤ اس طرح
موتی سجا کے لاؤ نگاہِ ملول میں

اِک بار ہم نے پار کیا چُپ کا ریگزار
پھر عمر بھر اَٹے رہے لفظوں کی دھول میں

○

صورت سے آشنا تھا مگر جانتا نہ تھا
پہچان کر بھی مجھ کو وہ پہچانتا نہ تھا

مرجائے گی ہوا مجھے اس کا گماں نہ تھا
تھک جائے گی صدا میرا جی مانتا نہ تھا

آخر اُسی نے تجھ پہ نچھاور کیا لہو
وہ شخص جس کو اپنا تو گردانتا نہ تھا

وہ دِن بھی یاد کر کہ بھرے شہر میں یہاں
تیرے سوا کوئی بھی تجھے جانتا نہ تھا

مَیں خوش کہ مِل سکا تجھے اِک اجنبی کی طرح
تُو مطمئن کہ میں تجھے پہچانتا نہ تھا

○

چمن میں آ کے عجب اپنے دِل کا حال ہُوا
نئی رُتوں کا تماشہ بھی اِک وبال ہُوا

ترا کمال تو یہ تھا کہ آنکھ لَو دیتی
جلے چراغ بُجھانا ترا کمال ہُوا

بَنے گا خشک جزیروں میں ایک دِن وہ بھی
مِلن تمہارا ہمارا اگر محال ہُوا!

وہی ہے ساعتِ مُردہ وہی در و دیوار
بُرے دِنوں کو گئے آج پُورا سال ہُوا

کرن کی نوک سے کٹنے لگا تمام بدن
سنہری دھوپ میں آ کر یہ اپنا حال ہُوا

سفر کا رُخ ہے تمہاری طرف وگرنہ مجھے
پلٹ کے جانا کبھی باعثِ ملال ہُوا

ہٹاؤ رات کا قصّہ، سحر کی بات کریں
وہ چشمِ صُبح کُھلی، مُنہ شفق کا لال ہُوا

بادل چھٹے تو رات کا ہر زخم وا ہُوا
آنسُو ذرا رُکے تھے کہ محشر بپا ہُوا

سُوکھی زمیں پہ بکھری ہوئی چند پتّیاں
کچُھ تو بتا نگارِ چمن تجھ کو کیا ہُوا

ایسے بڑھے کہ منزلیں رستے میں بجھ گئیں
ایسے گئے کہ پھر نہ کبھی لَوٹنا ہُوا

اے جُستجو! کہاں گئے وہ حوصلے ترے
کس دشت میں خراب ترا قافلہ ہُوا

پہنچے پسِ خیال تو دیکھا کہ ریت پر
اک پھُول کی طرح تھا وہ خیمہ کھِلا ہُوا

آئی شبِ سیہ تو دیئے جھلملا اُٹھے
تھا روشنی میں شہر ہمارا بجھا ہُوا

○

وہ دِن کہاں کہ ریت کے اندھے غُبار میں
تُم رُک گئے تھے میرے دلِ سوگوار میں

بکھرا پڑا تھا سارے چمن میں مِرا بدن
تُو نے پرو لیا کِسے پھُولوں کے ہار میں

اِک ایک کر کے بُجھتی گئیں مَشعلیں تمام
اب تیلیاں جلاتے پھرو تیرہ غار میں

آندھی کے پنکھ پھیل گئے آسمان پر
اِک ریگ زار بچھنے لگا لالہ زار میں

تُم گود سے زمین کی اُترے تو ہو مگر
کھیلو گے ساتھ کس کے خلا کے غُبار میں؛

دیکھا تو خوں میں لتھڑے پڑے تھے شجر تمام
سبزے گڑے ہوئے تھے ہر اِک شاخسار میں

جاؤ گے اب کہاں کہ زمانہ ہی رُک گیا
دیکھو غُبار تھم سا گیا رہگزار میں

○

گر ہم سے نہیں یہ گفتگو ہے
کیوں روئے سخن ہماری سُو ہے

مت اُس سے اُلجھ کہ وہ بھی آخر
پہنچے گا وہیں جہاں کہ تُو ہے

مَیں کیسے کروں تلاش تجھ کو
چہروں کا ہجُوم رُو برو ہے

بنجر ہے اگر پہاڑ یکسر
آئی یہ کہاں سے آب جُو ہے؟

اے میری دُکھی صدا ذرا سُن!
آواز سی کیا یہ سُو بہ سُو ہے!

بستی ہے کہ اِک گھنا سا جنگل
جنگل ہے کہ شہرِ تُند خُو ہے

دھن اپنا لُٹائے رات بھر وہ
شبنم کی اسی میں آبرُو ہے

تجھ سا بھی کوئی تو ہوگا آخر
مجھ ایسا اگر وہ ہُو بہُو ہے

○

آنکھ میں تیری اگر صحرا نہیں
حال پر میرے تو کیوں رویا نہیں

جانتا ہوں صبح کا تارا ہے تو
میری خاطر تو کبھی جاگا نہیں

دستکیں ہی دستکیں ہیں ہر طرف
آدمی اک بھی نظر آتا نہیں

مَیں صدا دُوں اور تُو آواز دے
اِس بھری دُنیا میں ممکن کیا نہیں

ہے ترے اندر ترا ہم شکل قید
وہ جسے تُو نے کبھی دیکھا نہیں

رو رہا ہوں ایک مُدّت سے مگر
آنکھ سے آنسُو کوئی ٹپکا نہیں

○

مٹی اُڑی تو پھولتی سرسوں کا دَم گھُٹا
شبنم گری تو سبز درختوں کا دَم گھُٹا

بھیگی ہوئی نگاہ سے دیکھا تو کیا نہ تھا
چلمن اُتر گئی تو مکانوں کا دم گھُٹا

آواز دی تو ساتوں فلک جھک کے آ گئے
لب سی لئے تو دونوں جہانوں کا دُم گھُٹا

دیکھا تو سارا دشت ہی اِک لالہ زار تھا
خوشبو گھنی تھی اتنی ہواؤں کا دَم گھُٹا

تُو ہی بتا کہ کیسے ہوا رُت جُگا تمام
اور کیسے شب کے پنچھی کی چیخوں کا دَم گھُٹا

○

پہلا ہی گرم لُو کا تھپیڑا نہ سہہ سکی
کہنے کو کشتِ دِل تھی ازل سے ہری بھری

پھر ہے تجھے تلاش اُسی ایک شخص کی
کترا کے جس سے مثلِ صبا تُو نے راہ لی

دیوار گر نہیں ہے تو چادر ہی اوڑھ لے
ننگے بدن کی ڈھال تو کاغذ کی ہے بنی

جنگل کی سمت آئے ہو صحرا کو چھوڑ کر
گھر کا یہ راستہ تمہیں بھولا نہ تھا کبھی؟

ہوتا ہے ذکر گلیوں میں اب آسمان کا
اندھوں کے بند شہر میں کیسی ہوا چلی

جھونکوں نے تار تار کیا پَو پھٹے کا خواب
کن پاگلوں کے ہاتھ ہماری قبا لگی؟

وہ عہدِ ابر و باد تو موسم کا کھیل تھا
نکلا جو آفتاب تو گرمی بہت پڑی

○

روک کر خوشبو نے میرا راستہ مجھ سے کہا
اے ہوا کے سرد جھونکے چھوڑ کر مجھ کو نہ جا

لڑکھڑاتے، کانپتے لفظوں میں تُو نے بات کی
کھو دیا تُو نے کہاں سیلِ رواں آواز کا

دِل زدوں کا امتحاں لیتی رہی زنجیرِ صُبح
کاروانِ شب کا لیکن سِلسلہ جاری رہا

گرمئ گفتار سے میری موم تو پانی ہوا
آنکھ سے تیری مگر پگھلا نہ دریا برف کا

کیا خبر تھی تو بھی سیّارہ بنے گا ایک دن
ایک ہی مرکز سے ہو گا تیرا میرا سلسلہ

در پہ اُس کے دستکیں تھیں مضطرب لیکن وہ شخص
اپنی ہی آواز کے آہنگ میں کھویا رہا

شام کے کھیتوں میں ننگے پاؤں چلنا چاہیئے
ہر طرف پھولوں کا سونا ہے یہاں بکھرا ہُوا

○

دھوپ کے ساتھ گیا ساتھ نبھانے والا
اب کہاں آئے گا وہ لوٹ کے آنے والا

ریت پر چھوڑ گیا نقش ہزاروں اپنے
کسی پاگل کی طرح نقش مٹانے والا

خشک شاخیں کبھی ایسے تو نہیں چیختی ہیں
کون آیا ہے پرندوں کو ڈرانے والا؟

عارضِ شام کی سُرخی نے کیا فاش اُسے
پردۂ ابر میں تھا آگ لگانے والا

سفرِ شب کا تقاضا ہے ترے ساتھ رہوں
دشت پُر ہول ہے طوفان ہے آنے والا

مجھ کو در پردہ سُناتا رہا قصہ اپنا
اگلے وقتوں کی حکایات سُنانے والا

شبنمیں گھاس، گھنے پھول، لرزتی کرنیں
کون آیا ہے خزانوں کو لُٹانے والا!

اب تو آرام کریں سوچتی آنکھیں میری
رات کا آخری تارا بھی ہے جانے والا